منٹو اور فلسفۂ وجودیت

ڈاکٹر تنویر الرحمٰن
لیکچرار(اردو)
گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، بھاگٹانوالہ (سرگودھا)

Abstract:

Existentialism, as a philosophical movement, gained great momentum in the 20th century and dominated and influenced almost all disciplines. Almost all literary writers and artists went with this wave, because it gave prime importance to man's existence. Saadat Hassan Manto dealt with major themes of existentialism in his writings. "Thanda Gosht", "Toba Taik Singh", "Darpok", "Boo", Kali shalwar", and "Hatak" etc. are evidence that prove Manto's Existentialist thoughts like 'Sartre', Manto violates traditional trends, exposes alienation, and meaninglessness. Furthermore, he believes in man's free will and freedom of choice.

Key Words: Existentialism, Disappointment, Meaninglessness, Freedom of choice, Partition, Social disorder, Internal distress

کلیدی الفاظ: فلسفۂ وجودیت، مایوسی، بے معنویت، انتخاب کی آزادی، تقسیمِ ہند، سماجی انتشار، داخلی کرب

بیسویں صدی کے سیاسی ، سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی انتشار کے باعث فلسفۂ وجودیت کو بے پناہ مقبولیت اور پذیرائی ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نظریے نے علم کے تمام شعبوں کو اپنے زیرِ اثر کر لیا۔ کوئی بھی نمایاں لکھاری یا فن کار اس کے اثر سے خالی نہ رہ سکا لہٰذا بیسویں صدی کے ادب میں جا بجا نظریہ وجودیت کے بہت گہرے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظریہ مغرب میں پروان چڑھا تاہم مشرقی ادب بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے اور ادب کی مختلف اصناف پر اس کے اثرات پوری طرح مرتب ہوتے چلے گئے۔ انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا نصف اوّل وہ عہد ہے جسے مغربی نظریات وافکار کی اردو میں آمد اور پذیرائی کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں جس سرعت سے

مغربی افکار نے مشرق کے ادبی منظر نامہ کو متاثر کیا، اس سے قبل ایسی مثال نہیں ملتی ۔ مشرقی ادب میں افسانہ ، ناول،ناولٹ، شاعری اورڈراما سمیت مختلف اصنافِ ادب نے مغرب سے بہت کچھ حاصل کیا بالخصوص ناول،ناولٹ اور افسانہ کا اردو میں آغاز ہی مغربی ادب کے زیر اثر ہوا۔ مغربی افکار کی اردو میں ترسیل کے اسی سلسلے کی ایک کڑی فلسفۂ وجودیت بھی ہے جس نے بیسویں صدی کی مختلف اصناف ادب کو متاثر کیا۔ مشرقی افسانہ، شاعری، ناول اور ڈراما میں نظریۂ وجودیت کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں ملتا ہے۔

فلسفہ وجودیت کی تفہیم اوراس کی وسعت کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظریہ دو بڑے گروہوں میں منقسم دکھائی دیتا ہے۔ ایک گروہ مذہبی جب کہ دوسرا غیر مذہبی ہے۔ مذہب اور خدا کے معاملے میں چند امتیازات کے باوجود دونوں گروہوں میں بیشتر اقدار مشترک ہیں اور دونوں گروہ انسان کی Existence کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ فرانسیسی فلسفی جان پال سارتر (Jean Paul Sartre) کو اس فلسفے کا علمبر دار کہا جاتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ اس کی کتب کو حوالے کا درجہ بھی دیا گیا۔ سارتر کا بنیادی تعلق غیر مذہبی گروہ سے ہے اور اس کا موقف ہے کہ انسان کو جس کائنات میں بھیجا گیا ہے وہ کیچڑ کی مانند ہے اور انسان کی زندگی مایوسی اور لا معنویت پر مبنی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کے پاس دو ہی راستے ہیں ؛یا تو اس کیچڑ میں پڑا رہے یا پھر اپنے عمل ، قوتِ ارادی کی آزادی اور Freedom of Choice کے زور پر اپنے آپ کو اس کیچڑ سے نکالے اور بے معنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق معنی دے۔ سارتر کا یہ جملہ Existence Precedes Essence فلسفۂ وجودیت کا نعرہ بن گیا۔ سارتر (1) کہتا ہے:

> "What do we mean by saying that existence precedes essence? We mean that man first of all exists, encounters himself, surges up in the world and defines himself afterwards."

انسانی وجود کا اثبات اور انسانی وجود کی افادیت ہی سارتر کا اہم نکتہ قرار پاتا ہے۔ وہ وجود کو محض جسم تک محدود نہیں سمجھتا بلکہ فکر، سوچ، تخیل اور نفسیات کو بھی انسانی وجود کا اہم حصہ مانتے ہوئے جسمانی آزادی سے زیادہ فکری اور نفسیاتی آزادی کا علم بلند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی لا معنویت پر مبنی زندگی کو معنویت سے آشکار کرنے کے لیے اس آزادی کا ہونا نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کے بغیر لا معنویت کی دلدل سے نکلنا ناممکن ہے۔ سارتر (1) ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"Life has no meaning or priority. Before you come alive, life is nothing."

سارتر کے نزدیک زندگی کا اصل مفہوم اسی وقت سامنے آتا ہے جب انسان فکری اور نفسیاتی سطح پر آزاد ہو کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کو معاشرتی، سماجی اور روایتی پابندیوں اور ضابطوں سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھنا چاہیے تاکہ وہ بے معنی زندگی کو اپنی مرضی اور آزاد فکر سے نئے معنی دے سکے۔ اس طرح سارتر کا یہ نظریہ یاسیت سے شروع ہو کر روشنی اور امید پر ختم ہوتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کے مایوس، منتشر اور بے راہ انسان کو عمل پر ابھارتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ انسان کے وجود کو اور اس کے اثبات کو بھی افسانے کا موضوع بنایا۔ انھوں نے نظریۂ وجودیت کو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی تحریروں میں انتہائی ماہرانہ انداز میں برتا ہے۔ منٹو نے بیسویں صدی میں جب قلم سنبھالا اس وقت سیاسی، سماجی اور ثقافتی انتشار اپنے عروج پر تھا، مایوسی کی فضا دبیز ہو چکی تھی۔ استعماریت کی چالبازیوں، مقامی اور سماجی سطح پر انتشار کی کیفیت اور تقسیمِ ہند کے وقت ہونے والی سماجی شکست وریخت نے بیسویں صدی کے انسان کو نہ صرف خارجی بلکہ داخلی سطح پر بھی کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کرب کی سب سے بڑی وجہ وہ سماجی ناہمواریاں قرار پاتی ہیں جو اُس عہد کا طرۂ امتیاز بن کر منٹو کی فکر اور تخیل کو متاثر کر رہی تھیں۔ تقسیمِ ہند کی صعوبتیں، تکلیفیں اور سختیاں دیکھنے اور جھیلنے والا سعادت حسن منٹو جب قلم اٹھاتا ہے تو پھر انتہائی بے باکی اور بے ساختگی سے زندگی اور معاشرے کی تمام ناہمواریوں کو نشان زد کرتا چلا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مشہور بھی ہے اور شاید بدنام بھی۔

منٹو کے عہد کی سماجی اور فکری فضا کے تناظر میں اگر سارتر کے نظریۂ وجودیت کی روشنی میں منٹو کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تحریریں اس نظریے کے کئی اہم پہلوؤں سے مزین دکھائی دیتی ہیں۔ منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، "ٹھنڈا گوشت"، "ہتک"، "بُو"، "کالی شلوار" اور "ڈرپوک" وغیرہ اس ضمن میں بہت اہم ہیں۔ ان افسانوں میں سارتر کے فلسفۂ وجودیت کا جو اہم اور نمایاں پہلو ہے وہ افسانہ نگار کی، روایتی ضابطوں، اصولوں اور پابندیوں سے بغاوت ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے منٹو نے جس انداز میں تقسیم پر پاکستانی بیانیے کی دھجیاں اڑائی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سماجی اور تاریخی علوم میں جس طرح تقسیم کو عظمت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے؛ منٹو نے اس کے بالکل برعکس تقسیم کو

ذلت اور رسوائی پر مبنی ایک غیر انسانی عمل قرار دیا ہے۔ اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان روایتوں اور سماجی ضابطوں سے بالاتر ہو کر ہی زندگی کو حقیقی معنی دے سکتا ہے۔ منٹو(2) کی روایتی، سماجی اور مذہبی پابندیوں کو "ٹھنڈا گوشت" کے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

"ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔" ہونے دے آج ظلم " اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لوؤں کو کاٹا، بھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے منھ بھر بھر کر بوسے لیے، چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی، لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔"

روایت سے بغاوت کے علاوہ منٹو نے "ٹھنڈا گوشت" میں زندگی کی بے معنویت کو بڑی بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے۔ وہ بے معنویت جو تقسیم کے بعد لوگوں کی زندگیوں کا خاصا بن گئی تھی۔ جس طرح سارتر کا انسان کیچڑ میں پھینکا گیا ہے، اسی طرح تقسیم کے عمل سے گزرنے والا منٹو کا کردار بھی اپنے آپ کو کیچڑ ہی میں گرا پاتا ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" میں ایشر سنگھ کا مکمل طور پر ٹھنڈا ہونا اور چھ آدمیوں کے قتل کے بعد ایک لڑکی کی لاش کے ساتھ زنا کی کوشش کرنا اسی مایوسیت اور بے معنویت کا نتیجہ ہے جس پر سارتر کے نظریے کی بنیاد رکھی گئی۔ انگریزی محقق بوہلمین /Bohlmann(3) کے اس قول سے مندرجہ بالا نکتے کو سمجھا جاسکتا ہے:

"World is utterly without absolute meaning"

ایشر سنگھ سمیت لاکھوں لوگوں کے لیے دنیا بے معنی ہو چکی تھی اور اس بے معنویت کا ادراک ہی اس بے معنی زندگی کو معنی دینے کی ایک کاوش ہے۔ یہی تڑپ اور احساس ہی کیچڑ میں پڑے انسان کو عمل پر ابھار سکتا ہے جس کا اظہار سارتر نے اپنے نظریہ وجودیت کی وضاحت میں بارہا کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے ایک اور افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں نظریۂ وجودیت کے نمایاں پہلوؤں کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس افسانے میں بھی منٹو نے سارتر کے نظریہ وجودیت کے اہم پہلوؤں مثلاً روایت سے بغاوت، مایوسیت اور بے معنویت کو سلیقے سے برتا ہے۔ روایت سے بغاوت کے ضمن میں دیکھا جائے تو پاکستان کی تقسیم کا بیانیہ جو تاریخی اور سماجی علوم میں تعصب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، منٹو نے اسے غیر انسانی اور انتہائی سفاک اور ظالمانہ عمل کے

طور پر دیکھا ہے۔ جس نے ہندوستان کے لوگوں کو مایوسی، ناامیدی، انتشار اور بے معنویت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان پاگلوں کے تبادلے کی کہانی ہے۔ افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ اس تقسیم نے پاگلوں کے پاگل پن میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا۔ لاہور کے پاگل خانے میں جب تبادلے کی خبر پہنچی تو پاگلوں میں افراتفری کا عالم تھا۔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے منٹو (4) کے افسانے کا ایک پاگل تو درخت پر چڑھ گیا اور چلا چلا کر کہتا ہے:

"میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔ میں اسی درخت پر ہی رہوں گا۔"

منٹو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کا عمل اتنا خوفناک اور ظالمانہ تھا کہ پاگل بھی دونوں ٹکڑوں کو رہنے کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ منٹو اس بے معنویت کو نئے معنی دینے کی کوشش کرتا ہے اور درخت کی صورت میں ایک تیسری جگہ تجویز کرتا ہے۔ جہاں پر دشمنی اور نفرت کے شوکتے ناگ محبتوں کو ڈس کر قتل نہ کرتے ہوں، جہاں انسان ہندو، سکھ اور مسلمان میں نہ بٹا ہو بلکہ محبتوں کے ٹھنڈے سائے میں انسانیت پروان چڑھتی ہو۔ منٹو کے نزدیک تقسیم کا عمل جس انداز سے ہوا اور اس کے مابعد اثرات جس طرح سماج پر مرتب ہو رہے تھے، وہ اس سماج میں بے معنویت اور مایوسی کی فضا کو پروان چڑھا رہے تھے۔ ہر شخص اپنی جڑوں سے اکھڑ چکا تھا اور مستقبل کے بارے میں مایوسی کا شکار تھا۔ دوسری طرف سارتر کے کیچڑ میں پڑنے کی مثال کے تناظر میں دیکھا جائے تو تقسیم کے عمل نے جس طرح انسانیت کو عزتوں کی پامالی، بھوک، افلاس، تنگ دستی اور سماجی اقدار کے انحطاط کی طرف دھکیلا وہ دراصل ایک کیچڑ میں گرنے سے بھی زیادہ خوفناک اور کرب ناک عمل تھا۔ منٹو اس صورت حال میں انسانی روح کے کرب کو نمایاں کرتا ہے کہ کس طرح ایک جما جمایا اور صدیوں سے آباد سماج یک لخت ایک ایسے جوہڑ کی شکل اختیار کر گیا جس میں گرنے والوں میں ہندو، مسلمان، سکھ نہیں تھے بلکہ انسانیت تھی۔ انسان کے وجود کی بے معنویت اور اس کی روح پر چھائی مایوسی جس طرح تقسیم کے عمل میں سامنے آئی، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

سعادت حسن منٹو کے ہاں وجودیت کے کئی عناصر ملتے ہیں۔ وہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کی صورت میں تقسیم کے عمل کے بعد کی صورت حال کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتے ہوئے وجودیت کے عناصر کو نمایاں کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ "ہتک" میں انسانی وجود کی بے معنویت اور مایوسی کے ساتھ ساتھ اس بے معنویت اور مایوسی سے نکلنے کی خواہش کو بھی وجودی تناظر میں سامنے لاتے ہیں۔ "ہتک" کی سوگندھی روزانہ کسی کی جنسی تسکین کا سبب بنتی ہے۔ یہ اس

کا پیشہ ہے۔وہ ایسا اگرچہ پیسے کی خاطر کرتی ہے جو اسے ملتا بھی رہتا ہے اور بعض اوقات ایک رات میں ایک سے زیادہ گاہکوں کو وہ تسکین بخشنے میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے لیکن اس سب کے باوجود اپنے وجود کا احساس اس میں شدت سے ابھرتا ہے۔ اسے اس صورت حال میں اپنا وجود بے معنی معلوم ہوتا ہے۔مایوسیت اس کے اندر چھائی ہوئی ہے۔یہ مایوسیت مادی حوالے سے نہیں بلکہ نفسیاتی اور جذباتی حوالے سے زیادہ شدت سے سامنے آتی ہے۔ اسے اس بے معنویت سے نکلنے کا جنون ہے۔وہ جسم فروشی کے جس کیچڑ میں گری پڑی ہے، وہ اسے مایوسی اور انتشار کا شکار کر رہا ہے جس سے نجات کے لیے وہ پریم کی خواہاں ہے اور جب اس کو پریم کی کوئی آس لگتی ہے تو منٹو(5)اس کے ہاں وجود کے اثبات، بے معنویت سے نکلنے کے جذبات کو یوں سامنے لاتے ہیں:

> "ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا" سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" او رسوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔۔۔۔پریم۔۔۔۔کتنا سندر بول ہے وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔۔۔یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے ۔کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپ تھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔"

سوگندھی یہ سب کچھ پیسے کی خاطر نہ کر سکتی ہے اور نہ کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ اپنے وجود کے حوالے سے جس بے معنویت اور یاسیت کا شکار ہو چکی ہے، یہ سب کچھ اسے اپنی مرضی کا معنی دینے، اس کا اثبات دلانے اور اپنے جذبات و احساسات کو کوئی سمت دے کر اس مایوسی سے نکلنے کی خواہش کا اظہار ہے۔وہ جس کیچڑ کا حصہ بنتی جا رہی تھی، اس نے اگرچہ اسے پیسا دیا ہے لیکن پیسا اس کی مادی ضروریات کی تکمیل تو کر سکتا ہے مگر اسے وہ فکری آزادی نہیں بخش سکتا جس کی وہ متمنی ہے ۔وہ اس فکری آزادی کے لیے نفسیاتی سطح پر جس کرب کا شکار ہو چکی اور جو خواہشات اس کے اندر پلتی ہیں، وہ سارتر کے نظریہ وجودیت کا عمدہ اظہار قرار پاتی ہیں۔منٹو کی سوگندھی سے سماج جس عمل کی توقع رکھتا ہے، وہ اس کی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے جب کہ سوگندھی جس طرح سوچ رہی، وہ سماج کی توقع سے بالکل برعکس ہے۔یہی وہ سوچ اور انتخاب کی آزادی ہے جو سارتر فرد کے لیے دیکھنے کا خواہاں ہے اور اسی نکتے پر اس کے فلسفہ وجودیت کی بنیاد ہے۔

جان پال سارتر کا فلسفہ وجودیت اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان معاشرے میں کسی سانچے یا قاعدے کا پابند نہیں ہے۔ اصل میں معاشرے کے بنے بنائے رستوں سے انحراف اور نئے رستوں کی تلاش ہی اسے زندگی کے حقیقی معنی کے قریب لا سکتی ہے۔ وہ جانور نہیں ہے جس کو معاشرہ چرواہے کی طرح اپنی مرضی سے ہانکتا پھرے بلکہ وہ خود ایک چرواہا ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور سامنے بے شمار رستے ہیں جن پر وہ اپنی آزادی کے ساتھ جہاں چاہے جا سکتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ سارتر اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ انسان کی زندگی مایوسی، بے معنویت اور انتشار سے بھری ہوئی ہے۔ اس بے ہنگم سی صورت حال میں انسان اپنے انتخاب کی آزادی اور عمل کی قوت سے بے معنی اور منتشر زندگی کو بامقصد اور یونیفارم (Uniformed) بنا سکتا ہے۔

منٹو کے افسانے "بُو" میں یہ تمام پہلو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کے معاشرے کی سماجی وثقافتی حقیقت اور اخلاقی منافقت بے ساختہ انداز میں رندھیر اور گھاٹن لڑکی کے کرداروں سے نمایاں کیے گئے ہیں۔ کہانی رندھیر کے گرد گھومتی ہے۔ رندھیر ایک نوجوان جو ایک تقریب میں شمولیت کے بعد گھاٹن لڑکی نامی ایک نچلے طبقے (Lower Class) کی عورت کے ساتھ رات گزارتا ہے جو بات بعد میں رندھیر کو پریشان کرتی ہے اور اس کے اعصاب پر سوار رہتی ہے وہ بذاتِ خود ملاقات نہیں ہے بلکہ گھاٹن لڑکی کے جسم سے پھوٹنے والی بُو ہے۔ گھاٹن لڑکی کے جسم سے پھوٹنے والی بُو مٹی کی بُو (6) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

> "برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابور ہو چکے تھے، ایک گدلے ڈھیر کی صورت میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں ایسی ہلچل سی پیدا کر رہی تھی جو سخت جاڑے کے دنوں میں نائیوں کے غلیظ لیکن گرم حماموں میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔"

درج بالا اقتباس کے مطابق گھاٹن لڑکی کے جسم سے پھوٹنے والی بُو، رندھیر کے ہاں ایک ایسی کیفیت پیدا کرتی ہے جو عام سماجی فہم کے مطابق انتہائی صاف ستھرے جسم اور قیمتی بناؤ سنگھار اور پرفیوم کے استعمال کے بعد بھی بہت مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ رندھیر کی گھاٹن لڑکی کے ساتھ یہ ملاقات اور اس ملاقات کے دوران پیدا ہونے والی رومانوی اور جذباتی کیفیت سارتر کے اس نظریے کی تائید کرتی ہے کہ انسان کی زندگی معاشرے کے بنے بنائے اصولوں

اور ضابطوں کی تابع ہر گز نہیں ہونی چاہیے۔ زندگی کے اصل رنگ اور معنی ان اصولوں اور ضابطوں سے ہٹ کر ہی ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ ایک عام شخص جو سماجی اصولوں اور ضابطوں کے تحت زندگی گزارتا ہے وہ میلے بدن اور پسینے کی بدبو سے، وہ لطف حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا جو رندھیر نے حاصل کیا۔ گھاٹن لڑکی، سارتر کے وجودیت پسند (Existentialist) کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے اوپر کسی قسم کا سماجی یا ثقافتی خول نہیں ہے بلکہ اپنی اصلی اور فطری حالت میں مطمئن ہو کر رندھیر کے ساتھ رات گزارتی ہے۔

منٹو کا افسانہ "کالی شلوار" ایک طوائف (Sex Worker) سلطانہ کی بے معنی اور بے مقصد زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ سلطانہ کی زندگی میں موجود لا معنویت (Meaningless) اور بے مقصدیت (Nothingless) یان پال سارتر کے فلسفہ وجودیت کے دو بنیادی ستون ہیں۔ منٹو (7) کا افسانہ یوں شروع ہوتا ہے:

> "دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: "دِس لیف ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے، جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔
>
> انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے۔ وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔"

سلطانہ کی بیس تیس روپے کے عوض تین چار گھنٹوں میں آٹھ دس گوروں سے شب بسری کسی رومانوی یا جنسی لطف یا سرمستی (Ecstasy) کا حصول نہیں بلکہ ایک بے معنی اور لطف سے خالی سرگرمی کی عکاسی کرتی ہے۔ سارتر کا مؤقف یہ ہے کہ انسان کے پاس اس دنیا میں دو ہی راستے موجود ہیں۔ پہلا رستہ یہ ہے کہ جس بے معنی، منتشر اور بے ہنگم دنیا میں اس دھکیلا گیا ہے وہ اس میں اسی طرح پڑا رہے یا دوسرا رستہ یہ ہے کہ وہ اپنے انتخاب کی آزادی اور عمل کی قوت سے اس حالت سے اپنے آپ کو نکال کر بے معنی زندگی کو معنی دے۔ زیادہ تر کردار اوّل الذکر راستے کا انتخاب کرتے ہوئے بے معنی اور بے مقصد زندگی گزارتے ہیں۔ سلطانہ بھی ایسا ہی ایک کردار ہے جو حالات کے آگے بے بس ہو کر طوائف والی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے انتخاب کی آزادی اور عمل کی قوت کو بروئے کار نہیں لاتی اور اسی مٹی

اور گارے میں پڑی رہتی ہے جس میں بنیادی طور پر انسان کو پھینکا گیا ہے۔ حالاں کہ اس کے پاس اور اس کے سامنے متعدد رستے موجود ہیں جن پر چل کر وہ باعزت، پر وقار اور بامعنی زندگی گزار سکتی ہے۔ ہماری عملی زندگی میں بے شمار خواتین بنیادی طور پر سلطانہ جیسے حالات سے نبرد آزما ہو کر خود کو ایک بلند مقام پر فائز کرتی ہیں۔

افسانے کا عنوان اور سلطانہ کی کالی شلوار کی خواہش سارتر کے فلسفہ وجودیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔"کالی شلوار" اصل میں بے معنی اور بے ہنگم زندگی کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ کہاجاسکتاہے کہ انسان کی زندگی بنیادی طور پر سلطانہ کی کالی شلوار سے مماثلت رکھتی ہے لیکن انسان کی قوتِ عمل، آزادیٔ انتخاب اور احساسِ ذمہ داری، اس کالی شلوار کو ایک پُر وقار پیراہن میں بدل سکتے ہیں جو زیب تن کر کے انسان نہ صرف انسان ہونے کا بلکہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کر سکتاہے۔

منٹو کے افسانے "ڈرپوک" کا مرکزی کردار جاوید زندگی کے غیر یقینی مزاج اور حالات کی ستم ظریفی سے اس درجہ بے بس ہو جاتاہے کہ وہ باقی انسانوں سے بھی نفرت شروع کر دیتاہے۔ جاوید کی اپنی ذات اور دوسروں سے نفرت اور بے زاری وجودیت کے اہم ترین نکتے بے معنی پن (Absurdity)، بیگانگی (Alienation) اور بے مقصدیت (Nothingless) کی ہُو بہُو عکاسی ہے۔ منٹو(8)لکھتاہے:

> "جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرناچاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصے تک اس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا تھا، غلاظت سے لتھڑے رہیں۔"

افسانے(8) کے متن میں جاوید کہتاہے:

> "مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتاہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرّے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے، اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لیے بے تاب ہے۔"

جاوید کی خوشبودار چیزوں سے بیزاری اور متعفن چیزوں کو سونگھنے کی رغبت سارتر کے اُس خیال کو تقویت بخشتی ہے جو وہ کہتاہے کہ انسان کی زندگی اس منتشر (Chaotic) اور بے معنی کائنات میں بے سمت اور بے مقصد ہے۔

جاوید کو خوشبودار چیزوں میں مقصد یا اطمینان نظر نہیں آتا تو وہ بدبودار چیزوں کو سونگھنے کی خواہش سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک غیر یقینی صورت حال ہے کہ بدبودار چیزیں بھی اس کو وہ مقصد، معنی اور اطمینان دے پائیں گی جس کے لیے بنی آدم ازل سے سرگرداں ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو منٹو نے جس سماجی حقیقت نگاری کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، اس کی درست تفہیم صرف سماج کے ظاہری خدوخال سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے منٹو کے کرداروں کے باطن میں اترنے کی ضرورت ہے۔ اس نفسیاتی صورت حال تک رسائی لازم قرار پاتی ہے، جس کے زیر اثر منٹو کے کردار نظریہ وجودیت کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کرتے ہیں۔ منٹو کے عہد کی انتشاری کیفیت کے ساتھ ساتھ اس کے کرداروں کے داخلی انتشار، بے معنویت کے احساس، حال اور مستقبل کے بارے میں یاسیت اور اس یاسیت اور بے معنویت سے نجات حاصل کرنے کا جو جتن نفسیاتی سطح پر سامنے آتا ہے، وہ ان کے کرداروں کے ہاں وجودیت کے احساس کا عمدہ نمونہ قرار پاتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں موجود کردار یان پال سارتر کے فلسفہ وجودیت کی مکمل عکاسی کرتے نظر آتے ہیں ، کہیں وہ یاسیت، لامعنویت اور بے مقصدیت سے لڑتے نظر آتے ہیں تو کہیں ان کے آگے بے بس ہو کر سر تسلیم خم کرتے پائے جاتے ہیں۔ جس طرح سارتر کے مطابق دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں: ایک گروہ وہ جو زندگی میں مقصد یا معنویت تلاش کیے بغیر ایک حیوانی زندگی بسر کرتا ہے جب کہ دوسرا گروہ ان چیدہ چیدہ انسانوں کا ہے جو لامعنویت او رکٹھن حالات سے ٹکرا کر اپنی قوتِ عمل اور آزادیٔ انتخاب کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک پروقار مقام تک پہنچتے ہیں نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک نیا جہان پیدا کرتے ہیں۔ بقول اقبال:

وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

منٹو کے افسانوی جہان میں مندرجہ بالا دونوں قسم کے کردار موجود ہیں۔ کہیں رندھیر سماج کے بنے بنائے ضابطوں سے بغاوت کرتا نظر آتا ہے تو کہیں سلطانہ اور جاوید حالات کی سنگینی کے آگے بے بس اور لاچار نظر آتے ہیں۔ منٹو نے وجودیت کے تمام پہلوؤں کو شعوری یا لاشعوری طور پر انتہائی مہارت کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کا وجودیت کے تناظر میں مطالعہ، ان افسانوں میں کئی چھپے ہوئے گوشوں کو آشکار کرتے ہوئے نئے معنی فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(1) Sartre, J. P. (1948). Existentialism and humanism. Methuen Publishers.

(2)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"ٹھنڈا گوشت"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز، لاہور،چودھری اکیڈمی،ص150

(3)Bohlmann,O.(1991). Conrad's existentialism. Macmillan Publishers.

(4)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"ٹوبہ ٹیک سنگھ"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز، لاہور،چودھری اکیڈمی،ص:214

(5)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"ہتک"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز،لاہور، چودھری اکیڈمی،ص:85

(6)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"بُو"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز،لاہور، چودھری اکیڈمی،ص:119

(7)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"کالی شلوار"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز،لاہور ،چودھری اکیڈمی،ص:65

(8)منٹو، سعادت حسن(1976ء)،"ڈرپوک"،مشمولہ،منٹو کے بہترین افسانے،مرتبہ:اطہر پرویز،لاہور، چودھری اکیڈمی،ص280،ص281